ہمارے مولانا

سید محمد ابوالخیر کشفی

ایک جمعے کو مسجد سے میری چپل غائب ہوگئی۔ مسجد سے جوتے چپل کا غائب ہونا تو مدت سے معمول کی بات ہے۔ حالی کو دنیا سے رخصت ہوئے اسّی سال سے زیادہ مدت بیت چکی ہے۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

پس یہ بات خاصی احتیاط سے کہی جاسکتی ہے کہ ''کفش دوزدی مسجد'' کی روایت نے ایک صدی تو مکمل کرلی ہے۔ چپل کی چوری کے بعد میں نے اس بات کو معمول بنالیا کہ مسجد میں جوتا یا چپل اتارتے ہوئے میں اسے ''ہدیہ'' کردیتا ہوں تاکہ چور، عذاب اور سزا دونوں سے محفوظ رہے۔ اب تو جوتا میں مسجد کے اندر بھی نہیں لے جاتا، باہر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔

چپل کی چوری کے خاصے دنوں کے بعد میں نے مولانا محمد عبدالرشید نعمانی مدظلہ کو یہ واقعہ سنایا اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ اب میرا جوتا، چپل چوری نہیں ہوتی۔ مولانا مسکرائے اور فرمایا کہ ''اب آپ کی چپل کیسے چوری ہوگی؟ آپ خاصے چالاک آدمی ہیں۔ چور تو چوری کی نیت سے مسجد میں آتا ہے۔ آپ اپنے جوتے کو ہدیہ قرار دے دیتے ہیں۔ اس کی نیت نے تو حرام چیز کو اس کا مقدر بنادیا ہے۔ وہ آپ کی پاپوش مبارک کیسے لے جاسکتا ہے۔'' مذاق ہی مذاق میں مولانا نے نیت اور عمل کے رشتے کو ہمارے لئے روشن کردیا۔

علم اور بالخصوص علم دین بہتوں کے پاس دیکھا ہے، مگر علم کا ایسا اطلاق اور مناسب استعمال اور تاویل نظر سے کم ہی گزری ہے۔ ہمارے مولانا بڑی سادگی سے اہم اور الجھے ہوئے مسئلوں کو حل کردیتے ہیں۔ ہمارے سوالوں کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ذہن بھی مطمئن ہوجاتا ہے اور قلب بھی۔

ایک دن میں نے مولانا نعمانی سے کہا کہ ہر جمعہ کی نماز میں اور کبھی کبھی دوسری نمازوں میں بھی ایک صاحب سے مسجد میں ملنا پڑتا ہے، وہ نہایت جھوٹے اور منافق ہیں۔ دوسروں کو آزار پہنچانے میں انہیں لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان سے مل کر بے حد تکدر ہوتا ہے اور طبیعت الجھتی رہتی ہے۔ نماز میں بھی دل نہیں لگتا۔ مولانا مسکرائے۔ فرمایا کہ ''آپ لوگ تو مسئلوں کو خود ہی الجھاتے ہیں۔ وہ صاحب آپ کو جب بھی ملیں، مسجد میں یا مسجد سے باہر، پہلے تو اپنے رب کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آپ کو ان جیسا نہیں بنایا ہے۔ یہ اللہ کے کرم کے سوا اور کیا ہے کہ آدمی نفاق اور جھوٹ سے بچ سکے۔ آج پورا معاشرہ زبان کی آفتوں میں مبتلا ہے۔ جھوٹ، بہتان، غیبت، بدگوئی، چغل خوری وغیرہ اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد ان صاحب کے حق میں دعا کیا کیجئے۔ وہ آپ کے کلمہ گو بھائی ہیں اور اس رشتے سے یہ ان کا آپ پر حق ہے۔''

مولانا عبدالرشید نعمانی سے ہمارے تعلقات اور قربت کی کہانی برسوں کے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کیمپس کے مکان نمبر سی-۴ میں ہم سال ہا سال رہے۔ ہمارا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ کمرے کے ساتھ چھوٹی سی بالکونی تھی۔ میں اور میری بیوی اکثر فجر کی نماز کے بعد بالکونی میں بیٹھ جاتے۔ چڑیوں کی تسبیح سنتے اور ان کے کلمات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ گھر کے سامنے میدان تھا اور اس کے بعد یونیورسٹی کی وہ سڑک جسے جامعہ کی واحد بڑی سڑک کہہ لیجئے۔ ایک طرف وہ ہمیں جامعہ سے باہر لے جاتی ہے اور دوسری طرف دوسری سڑکوں سے ملاقات کرتی ہوئی جامعہ کے ہر حصے تک لے جاتی ہے۔ ہمیں ایک ایسے بزرگ ۱۹۸۰ء سے نظر آنے لگے جنہیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ سفید لباس، کرتا شلوار اور ہاتھ میں چھڑی۔ قد الف کی مثال۔ کہیں کوئی خم یا جھکاؤ نہیں۔ ان کو چلتے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ ان کی چال ان کے کردار کا حصہ ہے۔ راستے، نپے ہوئے قدم، ہر قدم دوسرے کے برابر۔ اس دورِ ناہموار میں یہ ہمواری جیسے ہمارے تاریخ سے ہمارے رشتے کو جوڑ دیتی تھی۔ مجھے خیال آتا کہ یہ صاحب اپنے لباس، اپنی ریش دراز اور اپنی چال ڈھال میں سنت کی پیروی کا ہر لحہ لحاظ کرتے ہیں۔ ہر صبح ہم انہیں دیکھتے اور یوں وہ ہماری صبح کا حصہ بن گئے۔ ہمارا منظر نامہ ان کے بغیر نامکمل رہتا۔

ان دنوں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا اور جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو ٹہلتا ہوا اس مسجد تک جاتا جو جامعہ کے دفاتر کے قریب نیشنل بینک کے سامنے ہے۔ ایک دن میں اپنے گھر کے پیچھے دو منزلہ ڈی بلاک کی چھوٹی مسجد میں نماز فجر کی ادائیگی کے لئے گیا۔ دیکھا کہ وہی بزرگ فجر کی نماز پڑھا رہے ہیں۔ نماز کے بعد ان کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ ہمارے نوجوان رفیق کار شعبہ عربی کے استاد عبدالشہید صاحب نے بتایا کہ یہ بزرگ، ان کے والد گرامی مولانا عبدالرشید نعمانی ہیں۔ مجھے جتنی خوشی ہوئی اس کا اظہار میرے لئے ممکن نہیں۔ میں ان کی علمی شخصیت اور حیثیت سے اپنے محدود علم کی حد تک آگاہی رکھتا تھا۔ اردو کی

پہلی ''لغات القرآن'' کے مؤلف سے مدتوں پہلے لغات کے صفحات پر ملاقات ہو چکی تھی اور ابن ماجہ پر مولانا کی کتاب پڑھ چکا تھا، ایک مرتبہ سے زیادہ یہ کتاب دو تین کتابوں کا مجموعہ ہے، تاریخ تدوین واشاعت حدیث، علم الرجال اور ابن ماجہ۔

پھر مولانا سے ہر دن بلکہ ہر دن میں کئی بار ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہمارے گھر، ایک گھر میں بدل گئے۔ شہید میاں سے پہلے سے تعلق خاطر تھا۔ ''جوانانِ سعادت مند'' کی جماعت اب پرانی کتابوں کے صفحات ہی میں نظر آتی ہے۔ ہاں شہید میاں جیسے جوان خال خال موجود ہیں جواب دیکھنے دکھانے کے کام آتے ہیں اور اقبال کے اس خیال کی عملی تفسیر اور دلیل ہیں کہ آداب فرزندی، فیضانِ نظر سے سیکھے سکھائے جاتے ہیں۔

مولانا کی خدمت میں جب مجھے قربت حاصل ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہا کہ وہ ہفتے میں ایک دن درس حدیث شروع کر دیں۔ مولانا اس پر رضامند ہو گئے۔ علم حدیث کا فروغ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے۔ مولانا کے ہاں علم اور عشق کا عجب امتزاج ہے۔ جب وہ علم الرجال، تدوین حدیث، اصول نقد و جرح، معیار صحت حدیث پر گفتگو کرتے ہیں تو ان علما و محدثین کے نام لوح ذہن پر روشن ہوتے جاتے ہیں جو ہماری علمی تاریخ کا افتخار ہیں اور جب وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سناتے ہیں اور ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں تو ان کی آواز کی لرزش اور آنکھوں کے ستارے حدیث محبت بن جاتے ہیں۔ محبت میں اتباع کا مفہوم موجود ہے۔ نعمانی صاحب کی زندگی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت ہے۔ چودہ صدیوں کی مسافت کو طے کرتے ہوئے وہ اپنے آقا، اپنے سردار اور اپنے آرام جاں صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا علم اس سفر شوق میں ان کا رہبر ہوتا ہے۔

درس کا یہ سلسلہ ہم نے اپنی چھوٹی مسجد میں شروع کیا اور جمعے کا دن مقرر کیا۔ آغاز بہت حوصلہ افزا نہ تھا۔ دوسرے تیسرے جمعے کو بس دو حاضرین تھے۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ درس ہر دوشنبے کو میرے گھر پر نماز عصر کے بعد ہوگا۔ دوستوں کو اطلاع دی گئی، جامعہ کی مسجد کے نمازیوں تک درس کی خبر پہنچا دی گئی اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہفتہ وار نشست ایک ادارے کی صورت اختیار کر گئی۔ الحمدللہ پندرہ سال یہ سلسلہ ہمارے جامعہ کے مکان میں جاری رہا اور گلشن اقبال میں ہمارے مکان پر بھی درس حدیث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سلسلے میں توسیع ہوئی۔ برادرم ڈاکٹر منظور قریشی کے مکان پر بھی جمعہ اور اب اتوار کی صبح درس حدیث ہوتا ہے۔ جامعہ کے سلسلۂ درس میں ''الترغیب والترہیب'' کی تمام جلدیں پڑھی گئیں، پھر ''مشکوٰۃ'' شریف ختم ہوئی اور امام ذہبی کی ''الکبائر'' کا آغاز ہوا۔ سامعین کا ایک مستقل حلقہ بن گیا جس میں جامعہ کے استادوں سے لے کر ہمارے سلیمان بھائی اور چچا (رفیع الدین صاحب مرحوم) تک مختلف علمی صلاحیتوں اور عمروں کے لوگ شامل تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خوف شناس نہیں

ہیں، لیکن یہ حدیث کا اعجاز اور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جاوداں معجزہ ہے کہ ایک تبع سنت محدث کے لبوں سے ادا ہونے والے جملے اور کلمات ان کے دلوں میں اترتے گئے اور ان میں حدیث کا ایسا ذوق پیدا ہو گیا جو عربی اور دینی مدرسوں کی اعلیٰ جماعتوں کے طالب علموں میں بھی عام طور پر نظر نہیں آتا۔ ''الترغیب والترہیب'' میں ایک ہی مضمون کی احادیث کا تکرار ہے اور کثرت سے۔ مولانا کے درس میں آنے والے بعض ''علما'' نے آنا چھوڑ دیا۔ ان سے پوچھا کہ کیوں؟ جواب ملا کہ ''تکرار میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔'' لیکن ان عامیوں نے تکرار حدیث کی غایت کو سمجھ لیا اور سماعتِ حدیث علم افروزی کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ حظِ روحانی کا سبب بھی بن گئی۔ حدیث کی تاریخی صحت اور حجت ہونے پر ان کا یقین بڑھ گیا۔ مختلف راوی اکی ہی حدیث کو یکساں الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور اگر کہیں ایک آدھ لفظ بدل بھی جاتا ہے تو حدیث کے مفہوم میں فرق نہیں پڑتا۔

کبھی کبھی خصوصی موقعوں پر تسلسل سے قرأت حدیث کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو جاتا اور مولانا کسی خاص موضوع پر تقریر کرتے۔ انہوں نے علم الرجال اور اسماء الرجال پر چار تقریریں کیں۔ پروفیسر ریاض الاسلام صاحب نے کہا کہ علم کے دریا کے بہنے کا ذکر تو سنا تھا، اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مربوط حوالے، تاریخی ترتیب، محدثوں کی زندگی کے سنین، کتابوں کی تصنیف وتالیف کے سال اور لطف یہ کہ کبھی کسی تحریری یادداشت کا سہارا نہیں لیا۔ عبارتوں کی عبارتیں، وہ بھی مختلف ادوار کی کتابوں کی، مولانا پیش کرتے گئے اور حفاظِ حدیث کے حافظے کے جو واقعات ہم نے پڑھے اور سنے تھے ان کی صداقت پر ایمان پختہ تر ہو گیا۔

مولانا عبدالرشید نعمانی کا رویہ بھی علم کے دریا کا ہے۔ دریا جو اپنی روانی میں بہتا رہتا ہے اور پیاسے آکر اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور آگے چل دیتے ہیں، اپنی اپنی منزل کی طرف۔ دریا کو پیاسوں سے کوئی غرض نہیں، اس کا کام پیاس بجھانا ہے۔ وہ پیاسوں کے چہروں کی طرف بھی نہیں دیکھتا کہ کہیں احسان جتانے کا امکان نہ پیدا ہو جائے۔ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب مولانا اپنے صاحب زادے کے پاس کراچی آئے تو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے درجۂ اختصاص کے طلبہ کی علمی اور تحقیقی رہنمائی کرتے رہے اور پھر جب وہ رنچھوڑ لائن کے مکان سے اپنے صاحب زادے کے ساتھ کراچی یونیورسٹی منتقل ہوئے تو وہ خود طالبانِ علم کے لئے ایک ادارہ بن گئے۔ جامعۂ اسلامیہ بنوریہ ٹاؤن، دارالعلوم کورنگی، پنجاب کے مشہور دینی مدارس و جامعات سے فارغ شدہ طالب علم اور استاد ان کے پاس طلب علم کے لئے آتے ہیں۔ ان آنے والوں میں ترکی، سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے کتنے ہی عالم آتے ہیں، مولانا کی خدمت میں کچھ وقت گزارتے ہیں اور مطمئن ہو کر لوٹ جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو سلوک وتزکیے کی منزلوں میں مولانا کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ کتنے ہی وہ ہیں جو حدیث کی اجازت لینے آتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں ''سرکاری طور پر'' جو چیزیں بدلی ہیں ان میں

علم دین اور اس کے تقاضے بھی شامل ہیں، مگر علمی اور دینی روایات زندہ اور باقی ہیں اور افراد کے وسیلے سے مستقبل کا سفر کر رہی ہیں۔ ایسے ہی افراد کے لئے مولانا نعمانی کی ذات ''کوہ ندا'' کا درجہ رکھتی ہے۔ دمشق سے ایک بڑے عالم تشریف لائے، ان کا نام دنیائے عرب کی علمی دنیا میں درجۂ اعتبار رکھتا ہے۔ وہ تقریباً مولانا کے ہم عمر تھے۔ انہوں نے اجازت حدیث لی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کراچی آ کر ایک سال مولانا کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں، اگر ان کے ملک کی حکومت اور حالات نے اجازت دی۔

مولانا سے اکتساب فیض کے لئے آنے والے بیش تر علما انہیں کے در دولت پر قیام کرتے ہیں تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں۔ مجھے مولانا کی عنایات نے خاصا گستاخ بنا دیا ہے۔ میں اکثر ان سے عرض کیا کرتا تھا کہ آپ کے یہ دن اور سال بہت قیمتی ہیں۔ آپ اپنی تصانیف اور علمی منصوبوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیجئے اور اس سلسلے کو ذرا کم کر دیجئے۔ آپ کا علم مستقبل کی امانت ہے۔ اس ضبط سے تحریر میں لا کر مستقبل کے حوالے کیجئے۔ مولانا نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ایک عالم کو پڑھانا سو طالب علموں کو پڑھانے سے بہتر ہے اور یہ لوگ کتنی کتنی دور سے صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تفہیم کے لئے یہاں آ کر میری عزت افزائی کرتے ہیں۔ میں اگر ان کی پذیرائی نہیں کروں گا تو قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتنی شرمندگی ہوگی۔ میں اپنے آقا کے روبہ رو کس طرح کھڑا ہو سکوں گا۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا کا اپنے استادِ حدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی شیخ الحدیث اور العلوم ندوہ سے جو رشتہ اور تعلق تھا اور ہے اسے وہ کبھی نہیں بھول سکے اور اب طالب علموں کے باب میں وہ اسی روایت کو اپنے عمل سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا نعمانی غالباً ایک سال ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں کے ساتھ ان کے کمرے میں رہے۔ مولانا حیدر حسن خاں اپنی تنخواہ نعمانی صاحب کو دے دیتے اور انہوں نے اپنے اخراجات بتا دیے تھے۔ اتنے روپے گھر جائیں گے، یہ رقم یہاں کے اخراجات کے لئے ہے، ہم دونوں کے اخراجات کے لئے۔ یہ روپے ندوہ کے لئے ہیں اور یہ رقم غریب طلبہ کے لئے۔ مولانا اکثر اپنی گفتگو یا درسِ حدیث میں اپنے استاد کے ملفوظات بیان کرتے ہیں اور ان کے اسلوب حیات کو اپنے لئے چن لیا ہے۔ مولانا اگرچہ اپنے روپے اپنی جیب میں اپنے بٹوے ہی میں رکھتے ہیں مگر خرچ کرنے کے سلسلے میں اپنے استاد کا اتباع کرتے ہیں۔ جب انہیں ایک دینی ادارے سے چودہ سو روپے کا ''اعزازیہ'' ملتا تھا تو وہ پانچ سو روپے مسجد کے مدرسۂ حفظ القرآن کو دے دیتے تھے۔ اسی طرح دو تین سو روپے لوگوں کو ہدیتاً دیتے یا ضرورت مندوں پر صرف کرتے اور باقی ماندہ رقم کے بارے میں کہتے کہ ہماری ضروریات سے زیادہ ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بارہا کہ ان کا رب ان کے لئے رزق کریم و جلیل کے دروازے کس طرح

کھولتا ہے۔ مولانا کے ایک عقیدت مند نے ان کے لئے عمرے کا ٹکٹ بھیجا۔ اس سفر سعادت میں ہم بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ ایک شام مولانا کو کعبہ شریف کے باہر ایک صاحب ملے اور انہوں نے کہا، "ابن ماجہ پر آپ کی کتاب دمشق یا بیروت (شہر کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کے ایک ناشر نے شائع کی ہے اور وہ آپ کی رائلٹی ادا کرنے کے لئے مضطرب ہیں۔ وہ آج کل عمرے پر آئے ہوئے ہیں اور کل ہی آپ کا ذکر آیا تھا۔" انہوں نے مولانا سے کہا کہ کل ان صاحب سے آپ کی ملاقات کراؤں گا۔ مختصر یہ کہ مولانا سے ناشر کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے رائلٹی کی جو رقم دی اس سے مولانا نے اپنے عقیدت مند کو عمرے کے ٹکٹ کی قیمت واپس کی۔ ان صاحب نے قبول کرنے سے بہت معذرت کی، لیکن مولانا نے بڑے تیقن مگر سادگی سے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندوبست کر دیا ہے تو اب آپ کو ٹکٹ کی رقم واپس کرنا ہی مناسب ہے۔

اسی طرح شہید میاں اور آپ کی اہلیہ حج کے لئے بے قرار تھے۔ ۱۴۱۶ھ (۱۹۹۶ء) میں دونوں میاں بیوی کا نام قرعہ اندازی میں نہیں آیا تھا۔ یوں آتش شوق اور بھڑک اٹھی۔ اس سال کے حج کے زمانہ قرعہ اندازی سے کچھ پہلے ایک سعودی متمول صاحب علم آئے اور انہوں نے ہمارے مولانا سے اجازت حدیث حاصل کی۔ حدیث اور مولانا سے ان کی وابستگی کا یہ عالم کہ حدیث کے دو ایسے مجموعے مولانا سے انہوں نے طلب کئے جن پر مولانا نے اپنے نوٹس، یادداشتیں اور حوالے لکھ رکھے تھے۔ مولانا کے لئے دنیا کا ہر کام آسان ہے لیکن اپنی کتاب کسی کو دینا بہت مشکل ہے، لیکن ان صاحب کا شوق دیکھ کر مولانا انہیں کتابیں دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ان صاحب نے ان کتابوں کا ہدیہ پیش کیا اور پھر مولانا کی یادداشتوں اور نوٹس کی عکسی نقول بھی بھیج دیں۔ یہ ساری رقم مولانا نے شہید میاں کو دی اور کہا "دیکھو، شاید اللہ پاک نے یوں ہمارے حج کی سبیل پیدا فرمادی ہے۔" مولانا کا نام قرعہ اندازی میں آ گیا اور ان کی برکت سے بیٹے اور بہو کا نام بھی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک اور حج کی سعادت عطا کی۔ ایک بار اور مدینۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مولانا کے شب و روز گزرے، ایک بار اور انہیں سیدنا حمزہ اور جنت البقیع کے خوابیدگان خواب سے ملنے اور ان سے گفتگو کا موقع مل گیا۔

مجھے دوبارہ مولانا نعمانی کے ساتھ دیارِ حرمین میں وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ان کا وجود جیسے پگھل کر نور کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ مجھے تو وہاں مولانا ایک شفاف شیشے کی طرح نظر آئے۔ خلانوردوں اور قمرنوردوں کا خلا اور چاند پر پہنچ کر وزن بہت کم ہو جاتا ہے۔ مولانا کے لئے مکے اور مدینے کی زمین خلا کی طرح ہے جہاں اس دنیا کی وابستگیوں اور علائق کا وزن ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ سفر مولانا کے لئے شدید جذباتی دباؤ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسی سال کی عمر میں وہ عصر کی نماز کے لئے مسجد نبوی تشریف لاتے۔ یہیں روزہ کھولتے اور پھر تراویح کے بعد واپس تشریف لے جاتے۔ روزے کی حالت میں کم و بیش سات گھنٹے مسجد نبوی

میں گزارتے، مگر اس کے باوجود انہیں یہی خیال اپنی گرفت میں لئے رہتا کہ اس شہر اور اس مسجد کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے اور مولانا کی یہ کیفیت وطن واپس آکر بھی کافی دنوں تک برقرار رہتی ہے۔ ان دنوں بھی مولانا کی صحت نقطۂ اعتدال پر نہیں ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔

مولانا کے مزاج اور صحت کی اس کیفیت میں ان کے اس احساس سے اضافہ ہو جاتا ہے کہ میں اپنا کام نہیں کر رہا ہوں۔ مولانا، ڈاکٹر منظور قریشی صاحب سے ہر بار یہی سوال کرتے ہیں کہ ''کیا میں مدرسے میں پڑھانا شروع کر دوں؟ یا ڈاکٹر صاحب میں کب سے پڑھانا شروع کر سکتا ہوں؟'' مولانا مدرسۃ عائشۃ للبنات میں بخاری شریف کا درس دیتے ہیں اور عارضی طور پر اس سلسلے کے منقطع ہونے پر آزردہ رہتے ہیں۔ اسی طرح شمالی ناظم آباد کی ایک مسجد میں ہر جمعے کو نماز سے پہلے درس حدیث دے رہے ہیں اور خاصی مدت سے۔ اب ہر جمعے کو اپنے نہ جا سکنے کا ملال طبیعت کو کچھ اور اداس اور نڈھال کر جاتا ہے۔

دین کے ساتھ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے اس گہرے تعلق اور عملی انہماک نے ان کے گھرانے کو ہمارے اس دورِ پرآشوب اور عہد فتنہ ساماں میں ایک معیاری اسلامی گھرانا بنا دیا ہے۔ مولانا کے صاحب زادے پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالشہید نعمانی سلمہ، کراچی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان انہوں نے نہایت سلیقے سے مرتب کئے ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہ کی تابعیت کا بہت اچھا جائزہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ مولانا کی سب بیٹیوں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ مولانا کے تین پوتے اور تین پوتیاں قرآن حکیم حفظ کر چکی ہیں اور سب سے چھوٹے پانچ سالہ پوتے حفظ کر رہے ہیں۔ اس خاندان کو دیکھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں اندیشے کچھ کم ہو جاتے ہیں اور اس بات کی صداقت سامنے آتی ہے کہ اگر ہمیں خاندان کی اہمیت کا اندازہ ہو تو آج بھی خاندان ہمہ گیر ثقافتی یلغار کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ہمارے مولانا نے اپنی تصانیف اور تالیفات کو متاع دنیوی کے حصول کا کبھی ذریعہ نہیں بنایا۔ خود کسی نے رائلٹی دے دی تو قبول کر لی۔ شاید خیال ہو کہ انکار کفرانِ نعمت میں شامل نہ ہو جائے۔ ''لغات القرآن'' کی تالیف کے وقت نوجوان عبدالرشید نعمانی ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق تھے لیکن اس دور کے معاشی حالات کے اعتبار سے ساٹھ روپے بہرحال کم تھے مگر مولانا کی جمعیت خاطر منتشر نہ ہوئی۔ پاکستان میں کئی ناشرین نے ''لغات القرآن'' شائع کی۔ مولانا کی اجازت اور اطلاع کے بغیر اور کسی معاوضے کی ادائیگی یا معاہدے کے بغیر۔ ایک دن مولانا نے اس صورت حال کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ ہمارے ناشروں کا عام رویہ ہے۔ چند ہی ناشر ایسے ہیں جو مصنفوں کے حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین شفیق الرحمٰن صاحب کو اس سلسلے میں لکھتا ہوں۔ خود شفیق الرحمٰن صاحب اپنے ناشر کا شکار رہے ہیں۔ ان کی کتابوں کے چھ چھ ایڈیشن ختم

ہو جاتے اور ناشر صاحب یہی کہتے کہ ابھی پہلا ایڈیشن ہی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں نے اسی شفیق الرحمٰن صاحب کے نام ایک عریضہ لکھا جس میں دو ناشروں کے سلسلے میں یہی لکھا تھا کہ ان سے رائلٹی دلائی جائے۔ صبح مولانا صاحب نمازِ فجر کے بعد تشریف لے آئے۔ میں نے خط ان کی خدمت میں پیش کیا، مگر مولانا نے پڑھے بغیر واپس کر دیا اور فرمایا ''رات کو دیر تک میں اس مسئلے پر غور کرتا رہا، یہ خط نہ بھیجئے۔ دونوں ناشروں نے جو کیا وہ غلط سہی، لیکن اس سے قرآن فہمی کی فضا تو بہتر ہوگی۔ لوگ پڑھیں گے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی راضی ہوں گے۔'' لیجئے قصہ ختم ہوا۔

ہمارے مولانا نسلاً راجپوت ہیں۔ خون اور خاندان کا شخصیت پر جو اثر پڑتا ہے اس سے جینیات (Genetics) کے اس دور میں کون انکار کرے گا۔ شبلی نعمانی کے سوانح نگار اور نقاد ان کی دینی حمیت اور بعض اوقات شدت کو ان کی راجپوتی میراث قرار دیتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں مولانا عبدالرشید نعمانی بھی کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

مولانا تصویر کو بنیادی طور پر ناجائز بلکہ حرام سمجھتے ہیں اور تصویر کشی کے سلسلے میں کسی دلیل کو سننے کے لئے بھی آمادہ نہیں۔ لباس کے بارے میں بھی قومی عصبیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے کو میں اکثر چھیڑتا رہتا ہوں۔ میں ''ستر'' کے علاوہ اسلامی لباس کی کسی اساس اور بنیاد کو اولیت نہیں دیتا، ہاں اتباع سنت کا بے حد قائل ہوں۔ میں نے کئی بار یہ دلیلیں بھی پیش کیں کہ اگر امریکا، برطانیہ اور یورپ کی آبادی کی اکثریت یا قابل لحاظ تعداد مسلمان ہو جائے تو کیا وہ شلوار کرتا، شیروانی اور عبا پہننے کی مکلف ہوگی؟ اور ہمارا یہ لباس بھی تو قرونِ اولیٰ کا لباس نہیں۔ ان سب دلیلوں کے مقابلے میں مولانا کی یہ دلیل اجتماعی پس منظر اور قومی نفسیات کے اعتبار سے بہت وزنی ہے کہ ''مغرب والوں کا قومی لباس ہی کوٹ پتلون ہے اور کسی مسلم معاشرے کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ان معاشرتی باتوں اور روایات کو برقرار رکھے جو اسلام کے مطابق ہوں مگر کسی رشتے سے مغربی سوٹ کو اپنائے ہوئے ہیں؟ دوسروں کے لباس، زبان اور معاشرتی طور طریقوں کو مؤقر اور باعث عزت جاننا احساس کم تری کے سوا اور کیا ہے؟ ہمارا موسم تک سوٹ کو عذاب جانتا ہے۔ جس کا یہ عالم کہ سانس سینے میں نہیں سماتی اور بہتے ہوئے پسینے کی ''موجوں'' کو دریا کے پانی کی طرح آپ اپنے جسم کے میدانوں اور وادیوں میں بہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، مگر مجال ہے جو کوٹ اور ٹائی اتر جائے۔'' مولانا ہر دن اخبار پڑھتے ہوئے ہمارے اخبارات کے بگڑے اور بگڑتے ہوئے اسلوب پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ ''ون ٹو ون ملاقات''، ''گولڈن جوبلی''، ''سیکریٹریٹ''، ''پرائم منسٹر''، ''کنٹرول''، ''ریفرنس''، ''اینٹی ڈیموکریٹک'' مختصر یہ کہ اس راہ میں کوئی بھی ''فل اسٹاپ'' نہیں ہے۔

ہمارے مولانا انگریزی وضع کے بالوں کے لئے بھی اپنے نظام فکر میں کوئی جگہ نہیں پاتے۔ ان کے اور ان کے پوتوں کے سروں پر پابندی سے مشین یا استرا چلتا ہے۔ میری گستاخی کہ میں بچوں کے سامنے ہی اپنے اختلاف کا اظہار کرتا ہوں، ویسے دل چسپ بات یہ ہے کہ مدتوں سے مولانا کے پوتوں کے لئے بھی یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ میاں حارث تو سر منڈوانے کا ذوق رکھتے تھے۔ میں نے کئی بار مولانا سے کہا کہ بال رکھنا، بلکہ ایسے بال جو کان کی لو تک پہنچ جائیں سنت کے عین مطابق ہیں اور آپ اس معاملے کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ مولانا کی دلیل وہی قومی عصبیت کا معاملہ ہے جسے ابن خلدون نے اتنی اہمیت دی ہے۔

ہمارے مولانا کھانوں کے باب میں مشرق و مغرب کی تفریق کے قائل نہیں۔ یہاں تو حلال و طیب ہی معیار ہے۔ مولانا کو اپنی مٹھائیاں بہت پسند ہیں، کیک اور پیسٹری کے قائل نہیں ہاں کھا لیتے ہیں، مگر آئس کریم انہیں بہت مرغوب ہے۔ کہتے ہیں کہ آئس کریم کے ہر چمچے کے ساتھ لطافت، حلاوت اور ٹھنڈک جسم میں اترتی جاتی ہے۔ ہمارے بچوں کے سامنے جو کوئی نیا کھانا آتا ہے تو وہ اپنی ایک ہی دلیل پیش کرتے ہیں اور کھانے سے انکار کر دیتے ہیں ''ہم نے پہلے نہیں کھایا۔'' مولانا کھانوں کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے انہیں صفائی کا موقع ضرور دیتے ہیں۔ ''کھائے بغیر رد کرنا انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔'' ایک مرتبہ ہماری بیٹی عاکفہ سلمہا نے کئی ترکیبوں کو ملا کر میکرونی تیار کی۔ مولانا نے بڑے ذوق سے میکرونی کھائی اور بعد میں ایک دو بار فرمائش بھی کی۔ عاکفہ کی مسرت اور خوشی کا عالم نہ پوچھئے۔ مولانا کے ذوق غذا، پرکھ اور عمدہ کھانوں کی رغبت کا سبب یہ ہے کہ ان کی اہلیہ محترمہ بے حد اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ بہت سے حلووں کے بنانے میں انہیں کمال حاصل تھا، اور گزشتہ تیس چالیس برسوں میں ان کے بنائے ہوئے حلووں سے بہتر حلوے ہم نے نہیں کھائے۔ اب تو مولانا کی اس شکایت کو سمجھنے والے بھی کم ہوں گے کہ اب کھانے ہلکی آنچ پر نہیں پکائے جاتے۔ بھلا ''برگر'' اور ''پیزا'' کے اس دور میں ان لطافتوں کے لئے کس کے پاس وقت ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و اسوۂ حسنہ اور ارشادات سے مولانا کی وابستگی ایک وسیع، مسلسل نمو پاتی ہوئی نامیاتی صداقت ہے۔ وہ اسی تناظر میں سیدوں کی بڑی تکریم فرماتے ہیں اور اس دور کے سیدوں کو بھی ''اہل بیت'' میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے جب کبھی ان کے کسی پوتے کو کوئی چیز دی اور اس نے تکلفاً انکار کیا تو مولانا نے کہا: ''یہ جو کچھ دیں لے لیا کرو۔ انہی کے دروازے سے ہمیں دین ملا ہے اور اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔'' مولانا کے اس جملے کو وسعت اور سنگینی کے پہاڑ کے نیچے میری ذات ایک چھوٹی سی چیونٹی کی طرح دب کر رہ جاتی ہے اور میرا بس نہیں چلتا کہ اس پہاڑ کے نیچے بھی کہیں اور گم ہو جاؤں۔ مولانا کے اس احترام اور اظہار میں بھی تبلیغ کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ اس طرح وہ ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ

وہ کم وبیش اپنی ہر صحبت اور نشست میں اپنے اس گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ سیدوں، اعلیٰ نسب لوگوں، خوش حال اور تعلیم یافتہ حلقوں نے دین اور علم دین سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔'' ہر وقت آپ لوگ مولویوں پر تنقید اور اعتراض کرتے ہیں اور خود آپ کا یہ عالم ہے کہ بہترین بیٹے کو سائنس کی تعلیم کے لئے چن لیتے ہیں۔ پھر تجارت اور کامرس اور آرٹس کی تعلیم کے لئے۔ جو بچہ کسی قابل نہ ہوا سے مدرسے بھیجتے ہیں اور اس فیصلے سے پہلے اور بہت سی متبادل صورتوں پر غور کرتے ہیں۔ اگر غریب اور کچلے ہوئے طبقے کے بچے علم دین حاصل کریں گے اور وہ بھی زکوٰۃ و خیرات پر زندگی بسر کرتے ہوئے تو وہ علماء کہاں سے پیدا ہوں گے جو درباروں، سرکاروں میں بھی اقتدار کو للکار سکیں۔'' آپ میں ہمت ہو تو مولانا کی ان باتوں کی صداقت سے انکار کر دیں۔ انکارِ حق کی ہمت، حقائق سے رو گردانی کی ہمت۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی اسلام جیسا کچھ ہمارے معاشرے میں موجود ہے ان ہیں مدرسوں کی ٹوٹی ہوئی چٹائیوں کے طفیل موجود ہے۔

ایک اور چھوٹی سی بات، کم وبیش ایک صدی سے ہمارے ہاں کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے مگر ان جامعات نے کتنے قاسم نانوتوی، کتنے اشرف علی تھانوی، کتنے شبلی، کتنے حالی، کتنے ابوالکلام آزاد، کتنے شبیر احمد عثمانی، کتنے حسین احمد مدنی، کتنے یوسف بنوری اور کتنے عبدالرشید نعمانی پیدا کئے ہیں؟ ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب دیا جائے۔ کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن پر غور کرنا لازم ہے اور سنجیدگی کے ساتھ۔

مدارس کے 5 وفاقوں کو بورڈ کا درجہ دینے کا اعلان

وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے کہا ہے کہ ملک بھر کے مدارس کو قومی دھارے میں لانے کے لئے تنظیمات المدارس کے پانچوں وفاقوں کو بورڈ کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اسلام آباد میں اتحاد تنظیمات المدارس کے نمائندہ وفد مفتی منیب الرحمٰن، قاری حنیف جالندھری، پروفیسر ساجد میر، ڈاکٹر عطاالرحمٰن سے ملاقات کے بعد میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے رحمان ملک نے کہا کہ ملک بھر کے نمائندہ علماء سے مذاکرات کے بعد طے پایا ہے کہ مدارس کے پانچوں وفاقوں کو بورڈ کا درجہ دیا جائے گا اور تمام مدارس میں باہمی مشاورت سے ایک قسم کا نصاب متعارف کروایا جائے گا جس میں جدید عصری علوم بھی پڑھائے جائیں گے، انہوں نے کہا کہ اس حوالے سے ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی جس میں تمام مدارس کے نمائندہ علماء اور حکومتی ارکان شامل ہوں گے کمیٹی کی منظوری کے بعد بل منظوری کے لئے پارلیمنٹ میں باقاعدہ پیش کر دیا جائے گا۔ اس موقع پر علما نے میڈیا کو بتایا کہ حکومت مدارس کے اصلاحات کے لئے مخلص ہے اس لئے تمام مدارس کے وفاق حکومت سے تعاون کریں گے، انہوں نے کہا کہ اب تک 15 ہزار مدارس رجسٹر ہو چکے ہیں اور بل کی منظوری تک تمام مدارس اپنی رجسٹریشن کا عمل مکمل کروالیں گے۔

☆☆☆